فکرِ مُطمئنّہ

شاعر اہلبیت علامہ نجم آفندی
کے سلاموں کا مجموعہ

محقیق و تدوین
ڈاکٹر سید تقی عابدی

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

کتاب	:	**فکرِ مطمئنہ**
تحقیق وتدوین اور تنقید	:	**ڈاکٹر سیّد تقی عابدی**
سنہ اشاعت	:	2006ء
تعداد	:	1000
کمپوزنگ	:	افراح کمپیوٹر سنٹر نئی دہلی۔25
ایڈیشن	:	اوّل
باہتمام	:	**ڈاکٹر شاہد حسین**، نئی دہلی

یہ کتاب

مرتب محقق و ناقد ڈاکٹر **سیّد تقی عابدی** (کنیڈا) اور

ناشر **ڈاکٹر شاہد حسین**، شاہد پبلی کیشنز، 2253 دریا گنج، نئی دہلی (انڈیا)

کی اجازت سے شائع کی گئی

رَو میں ہے رَخشِ عمر

نام : **سید تقی حسن عابدی**

ادبی نام : تقی عابدی

تخلص : تقی

والد کا نام : سید سبط نبی عابدی منصف (مرحوم)

والدہ کا نام : سنجیدہ بیگم (مرحومہ)

تاریخ پیدائش : یکم مارچ 1952ء

مقام پیدائش : دہلی (انڈیا)

تعلیم : ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا) ایم ایس (برطانیہ)
الیف سی اے پی (یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ)
الیف آرسی پی (کنیڈا)

پیشہ : طبابت

ذوق : شاعری اور ادبی تحقیق

شوق : مطالعہ اور تصنیف

قیام : ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کنیڈا

شریک حیات : گیتی

اولاد : دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا اور مرتضیٰ)

تصانیف : شہید (1982ء) جوشِ مودّت۔ گلشن رویا۔ اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔء۔ رموز شاعری۔ اظہارحق۔ مجتہد نظم مرزا دبیرؔ۔ طالع مہر۔ سلک سلام دبیرؔ۔ تجزیہ یادگار انیسؔ۔ ابواب المصائب۔ ذکر دُربارانِ۔ عروسِ سخن۔ مصحفِ فارسی دبیرؔ۔ مثنویات دبیرؔ۔ کائنات نجم۔

زیر تالیف : تجزیہ شکوہ جواب شکوہ۔ رباعیات دبیرؔ۔ فانی شناسی۔ مصحفِ تاریخ گوئی۔ روپؔ کنوار کماری۔ تعشق لکھنوی۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

دردِ دل

کس کس سے سوال کروں؟

علامہ نجم آفندی نے کہا تھا:

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

① اردو کے مشاہیر شعرائے غزل نے نجم کی قدر دانی کیوں نہ کی؟
(195) عمدہ اور اعلیٰ ترین غزلوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟
کیا 1955ء کا آل انڈیا مشاعرہ یاد نہیں جس میں نجم نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا؟ 0

② اردو کے ترقی پسند تحریک کے نمائندوں نے کیوں نجم کو نظر انداز کیا؟ اردو ادب میں کسان، مزدور، مزدوری اور سرمایہ داروں کے خلاف نظموں میں پہلی آواز علامہ اقبال اور جوش سے قبل نجم کے سوا کس نے بلند کی؟ اگر بقول سلیمان ندوی، حسرت موہانی اسلامی اور سوشلسٹ رجحان رکھ کر بیسویں صدی کے ابوذر غفاری ہو سکتے ہیں اور تحریک کے بھی پسندیدہ شاعر رہ سکتے ہیں تو نجم کی مسلمانی کیوں برداشت نہ ہوئی؟

③ نعت کے پرستاروں نے صدہا نعتیہ آبدار اشعار اور سولہ سے زیادہ نعتوں کو کیوں طاقِ نسیاں کے سپرد کیا؟
کیا نجم کے اس شعر میں کسی کو شک ہوسکتا ہے؟

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

④ کیوں افسانہ نویسوں نے عمدہ افسانہ ''چور ماموں'' نہیں پڑھا؟ کیوں ناول نگاروں نے تخلیقی شاہکار ناول ''بندۂ خدا'' کو فراموش کیا؟

شریک حال نہ ہوتی جو نجم خودداری
ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

⑤ اردو میں کتنے شاعر ہیں جنھوں نے نجم کی طرح چھ سو سے زیادہ عمدہ رباعیاں لکھیں؟ کیوں اردو رباعیات لکھنؤ کے پی ایچ ڈی (Ph.d) کے مقالے میں نجم کا نام تک نہیں؟ جبکہ پانچ اور دس رباعی کہنے والے افراد کا ذکر آب وتاب کے ساتھ ہے۔ کیا اس قسم کے مقالوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

⑥ شاعرِ اہلِ بیتؑ کا خطاب دے کر محبانِ اہلِ بیتؑ کیوں نجم سے غافل ہوگئے؟ مولویوں، خطیبوں نے منبر سے کیوں ان کا پیغام نہیں پہنچایا؟ سلاموں، نوحوں، مرثیوں کو لے کر دوسرے انقلابی کلام کو کیوں تلف کردیا؟ کراچی میں اتنے بڑے شاعر کے جنازے میں کیوں صرف بیس (20) پچیس (25) افراد شریک ہوئے؟

⑦ کیوں نجم کے کلام کو محبانِ اہلِ بیتؑ، گروہانِ نوحہ خوان، پرستارانِ نجم، شاگردانِ رشید، عزیز و اقربا نے انتقال کے تیس (30) برسوں میں بھی شائع نہیں کیا؟ اگرچہ نجم نے کہا تھا:

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

⑧ اردو ادیبوں اور تنقید نگاروں نے اس بیسویں صدی کے عظیم شاعر سے کیوں غفلت برتی؟ نجم کے (12799) اشعار، (195) غزلیں، (591) رباعیات، (498) قطعات، (16) نعتیں، (81) قصائد، (107) سلام، (144) نوحے، (83) متفرقات کے علاوہ (3) مرثیے، (18) ہندی کلام کے آثار اور کئی نثری کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہیں:

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لئے
یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

میں نے حقیقت کو پیش کیا ہے:

نجم بہتر ہے تصنّع کی دلآویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

⑨ کانگریس، مسلم لیگ اور دوسرے قومی سیاسی عہدے داروں نے ایسے وطن دوست شاعر کو وطن کی محبت میں کیا دیا؟ جبکہ

ع: منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کائناتِ نجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے۔ صرف گردشِ اوراق شرط ہے۔ شاید یہ میری نجمی عقیدت اور اُردو محبت ہو۔ یہ ایک خوشگوار حادثہ تھا جس کے فیض سے میں کائناتِ نجم کو دریافت کرسکا:

یہ بھی اک حادثہ اُردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

خیر اندیش

سیّد تقی عابدی

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

نجم آفندی کا زندگی نامہ

نام　　مرزا تجمل حسین
تخلص　　نجم۔ نجمی
شہرت　　نجم آفندی
گھریلو نام　　نادر مرزا

تاریخ ولادت: رمضان 1330 ہجری مطابق 1893ء

مقام ولادت: اکبرآباد (آگرہ) کٹرہ حاجی حسن جو پیپل منڈی کے پیچھے واقع ہے۔

والد　　مرزا عاشق حسین بزم آفندی۔ معروف شاعر اپنے سگے ماموں سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی متوفی 1880ء کے شاگرد رہے۔ ان کی پیدائش 1860ء میں کٹرہ حاجی حسن آگرہ میں ہوئی۔ شادی آغا حسین صاحب صاحب دیوان شاعر کی بیٹی سے ہوئی۔ دوسری شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی۔ آپ بزم تخلص کرتے تھے۔ معروف غزل گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ بزم آفندی کا انتقال 23 مارچ 1953ء کو ہوا۔

دادا　　مرزا عباس ملیح جو مرزا نجف علی بلیغ کے فرزند تھے جو مرزا فصیح مشہور مرثیہ گو شاعر کے حقیقی بھائی تھے۔ اسی لیے تو نجم آفندی نے مرزا فصیح کی میراث پر فخر کرتے ہوئے فرمایا:

نجم میں ہوں خاک پائے مسند آرائے فصیح
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

پردادا: مرزا ہادی علی فیض آبادی۔ مرزا ہادی علی کے تین فرزند تھے۔ (1) مرزا جعفر علی فصیح (2) مرزا نجف علی بلیغ (3) مرزا فصیح۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کے پردادا ہادی علی فیض آبادی حضرت عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن جب ان کے بزرگ بلاد ایران میں رہنے لگے تو وہاں ''مرزا'' مشہور ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد ان کے بزرگ شاہجہاں آباد (دہلی) میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔

معز الدین قادری اسرار و افکار میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی کے پردادا مرزا ہادی علی فیض آباد کے محلہ ''مغل پورہ'' میں رہتے تھے چنانچہ نجم آفندی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مرے بزرگوں کا اصلی وطن ہے فیض آباد
مجھے بھی شوق تھا دیکھوں میں یہ در و دیوار

اجداد: نجم آفندی کے اجداد ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔

بھائی بہن: دو بھائی (1) مرزا اعجاز حسین مرحوم اکیس برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ یہ عمر میں نجم سے بڑے تھے۔

(2) مرزا سلیمان کوکب آفندی، چھوٹے بھائی جن کی صاحبزادی مشہور مرثیہ نگار شاعر باقر زیدی کی شریک حیات ہیں۔ ایک بہن شہزادی فرطیس بانو اختر جہاں بیگ کلاہ پروین پیدائش 1901 جو بزم آفندی کی دوسری انگریز بیوی کے بطن سے تھیں۔ پروین بیگ کلاہ عمدہ شاعرہ تھیں۔

شریکِ حیات: 1958ء میں گلے کی کینسر سے انتقال کر گئیں۔ کانپور کے ایک معزز گھرانے کی صاحبزادی تھیں۔

اولاد: (1) پانچ لڑکے۔ جن میں چار لڑکے عباس، کامران، تاجدار اور تسلیم بچپن میں مر گئے اور اکلوتے بیٹے ہمایوں مرزا المتخلص سہیل آفندی حیات ہیں اور حیدرآباد

دکن میں مقیم ہیں۔

(2) سات لڑکیاں۔ ایک بیٹی کا کمسنی میں انتقال ہوگیا۔ دوسری لڑکی ناکتخدا تھی۔ دو بیٹیاں شادی کے بعد پاکستان چلی گئیں اور دو بیٹیاں ہندوستان میں مقیم رہیں۔

تعلیم وتربیت: 1- نجم آفندی کی اردو اور فارسی تعلیم گھر پر ہوئی۔

2- قرآن مجید اپنے چچا مرزا ہادی علی سے پڑھا

3- مفید عام اسکول آگرہ سے انگریزی میں مڈل پاس کیا۔ اس اسکول میں اردو فارسی مولوی سلامت اللہ سے اور انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر راج کمار سے پڑھی۔

4- اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری لکھتے ہیں۔''نجم آفندی کو اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی درک ہے۔ ان کی ہندی زبان میں بھی تصنیفات ملتی ہیں۔''

5- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبستان دبیر میں لکھتے ہیں۔نجم آفندی اردو، فارسی اور عربی اچھی جانتے ہیں اور انگریزی میں بھی اچھا درک رکھتے ہیں۔

6- ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر وفن میں لکھا۔''اردو فارسی کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن محض قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کو عربی تعلیم کا حصول سمجھ کر مالک رام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو مغالطہ ہوا ہے۔خود نجم آفندی نے اپنے خط میں عربی نہ پڑھ سکنے کے بارے میں لکھا ہے۔

7- اردو فارسی اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ انھیں گھر پر عام طور سے انگریزی ناول کو بھی مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

8- نجم آفندی شمشاد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں''میری تعلیم اس زمانے کے مڈل تک ہوگی مگر کم ازکم انگریزی کی دو ہزار کتابیں ہر قسم کی میری نظر سے گزری ہیں۔

شکل وصورت: شکل وصورت تصویر سے ظاہر ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔نجم آفندی کا قد تقریباً پانچ فٹ تھا۔ بدن چھریرہ، رنگت سرخ وسپید تھی۔ چہرہ کول خوبصورت ناک اور باریک ہونٹ کے ساتھ بڑے کان اور سر بھی نسبتاً بڑا تھا۔ آخری عمر میں بال

بہت کم رہ گئے تھے۔ خشخشی داڑھی جو مونچھوں سے متصل تھی۔ آواز رعب دار اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔

وضع اور لباس: نجم آفندی نستعلیق شخصیت تھے۔ وہ مشرقی روایات کے پاسدار اور اسلامی تہذیب کے نمونہ تھے۔ جوش ملیح آبادی نے ساقی جوش نمبر میں لکھا۔ ''حضرت نجم آفندی جو اس قدر دین دار و پابند وضع بزرگ ہیں کہ قہقہہ مارنے کو بھی خلاف شرع سمجھتے ہیں۔''

نجم آفندی کے لباس میں سادگی تھی۔ وہ عام طور پر سفید شیروانی، سفید پائجامہ، مخمل کی کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھار کالی شیروانی پر شال اوڑھ لیتے تھے۔ پاؤں میں معمولی سلیپر یا جوتا ہوتا۔ ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی رکھتے تھے۔ عینک صرف حسب ضرورت لگاتے۔

غذا و خوراک: نجم آفندی کم خوراک تھے۔ دیسی گھی اور گڑ سے شدید رغبت تھی۔ ان کی گھی اور گڑ کی چاہت کی کئی داستانیں لوگوں نے بیان کی ہیں۔

سیرت و کردار: ہم نجم آفندی کی سیرت اور عالی کردار کے ساتھ عجز و انکساری کا مختصر خاکہ معز الدین قادری اور ذاکر حسین فاروقی کی تحریروں سے پیش کرتے ہیں۔ اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری نے لکھا ہے۔ ''خاندانی روایات مذہبی تعلیم و تربیت اسلام کی عظیم شخصیتوں کے نقوش قدم کو اپنا راستہ بنانے کی سعی و تمنا نے ان کو کافی متوازن، معتدل مزاج اور بنی نوع انسان کا ہمدرد بنا دیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں بصیرت کی چمک ہے اور سنجیدگی کے نہ جانے کتنے راز ہیں۔ انھیں بنی نوع انسان سے محبت ہے۔ شخصی اور مذہبی عقائد پر خود بختی کے ساتھ کاربند ہیں لیکن سیرت و کردار میں کہیں بھی ''ملا پن'' یا پندار زہد'' کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سوانگ موجود نہیں۔ بُردبار، حلیم، خوش خلق اور مصیبتوں میں مسکرانے والی شخصیت ان کے سارے کلام سے جھلکتی ہے اور انھیں یہ کہنے کا حق ہے

میری تلاش راہ پر ہنستے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل میری گردِ راہ کی

بقول جوشؔ ملیح آبادی۔ جہاں تک طبائع کا تعلق ہے، باپ بیٹے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور اِن کو رنگینی کبھی چھو کر نہیں گئی تھی۔ وہ سراپا رند تھے اور یہ سرتا بہ قدم متقی اور خشک قسم کے متقی تھے۔

دبستانِ دبیرؔ میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بیان کرتے ہیں: ''مروّت وضع داری، ایفائے وعدہ، حُسنِ معاشرت اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ یکساں برتاؤ آپ کے کردار کی وہ خوبیاں ہیں جو ہر شخص کے دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ نجمؔ صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے تھے وہ تا حیات ان پر کاربند رہے اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ان کی کامیاب زندگی ''قابلِ رشک موت'' کی ضامن بن گئی۔ بقول خود:

کچھ شعر جو منقبت میں کہہ لاتا ہے
اس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہلِ بیت کہلاتا ہے

شغل و ملازمت:

1- ریلوے محکمہ میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت نجمؔ کی عمر بیس سال تھی۔
2- پھر دہلی میں ملازمت کی۔
3- کالکا اسٹیشن اور غازی پور اسٹیشن پر کچھ عرصہ ملازم ہوئے۔
4- تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہو کر ریلوے کی ملازمت ترک کر دی اور تلاش معاش میں ردولی پہنچے اور کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔
5- جونیئر پرنس معظم جاہ مجیؔ کے دربار سے منسلک ہوئے۔ ان کے سپرد پرنس کے کلام کی اصلاح تھی۔ تنخواہ بھی اس کام کی پاتے تھے۔ نجمؔ کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپے ماہوار تھی۔
6- دربار سے علاحدہ ہو کر مالی پریشانیوں میں بسر کی اور اپنی خودداری کو نبھانے اور پیٹ

میں خرید کر یہ رقم یتیم خانہ کی خدمت کے لیے وقف کردی۔کبھی محفل مقاصدہ میں صفی لکھنوی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ''نجم صاحب ہم نے بائیس(22) سال اس محفل میں چراغ جلایا ہے اب آپ کی باری ہے۔''

خطاب: ناصر الملت نے نجم آفندی کو''شاعر اہلبیت کا خطاب دیا جو نجم آفندی کے مسلسل سلام اور قصیدہ نگاری کا اثر تھا۔

یہاں یہ بات بھی خارج ازمحل نہیں کہ نجم آفندی کے دادا کے بھائی مرزا فصیح کو خلافت عثمانیہ کی جانب سے آفندی خطاب کعبتہ اللہ اور حاجیوں کی خدمت کرنے پر دیا گیا تھا جو نسلاً بعد نسل استعمال ہوسکتا تھا۔

ہم عصر شعراء: حالی، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، سائل دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، نسیم، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، مرزا اوج، دولھا صاحب عروج، مرزا ثاقب، آرزو لکھنوی وغیرہ بزرگ عمر ہم عصر شعرا تھے جب کہ ان کے ہم عمر شعرا میں فانی، جوش، صدق جائسی، یگانہ، سیماب، مہذب لکھنوی، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، سید آل رضا وغیرہ شامل تھے۔

تلامذہ: نجم آفندی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔خود انھوں نے جو فہرست جلیس ترمذی کو روانہ کی تھی اس میں(69) نام تھے۔وہ بعد میں بڑھ کر(72) ہوگئی، اور کچھ اس طرح ہے جسے ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر وفن میں نقل کیا ہے۔رعنا اکبرآبادی، جعفر مہدی، رزم رودلوی، صفدر حسین کاظمی، عبدالسعید رشک، عابد مرحوم، وزارت علی، علی انجم اکبرآبادی، مرزا عبدالکریم مضطر، کوکب اکبرآبادی، جلیس ترمذی، انتظام الحسینین، خاور نوری، سعید شہیدی، مرزا عادل، ساجد رضوی، شاہد حیدری، عازم رضوی، قائم جعفری، عباس عابدی، خورشید جنیدی، باقر منظور، طاہر عابدی، خواجہ ضمیر، کاوش حیدری، منجو قمر، راحت عزمی، تصور کرت پوری، عباس زاہد، شہید یار جنگ، ہشیار جنگ، ڈاکٹر اختر احمد، تبسم نظامی، طالب رزاقی، حرماں خیرآبادی، عاصم جمیل، ساحر نجمی، سعید السائمہ، زیبا رودلوی، پرنس معظم جاہ شجیع، ہاشم جاں بہادر، اختر زیدی، حسن مدنی، اثر غوری، کاظم رشک، شاغل حیدرآبادی، صمیم

حیدر، محبؔ جاورہ، صادقؔ نقوی، سوزؔ رضا ترمیم، تقیؔ عسکری، اقبالؔ عابدی، سید جعفرؔ حسنین، زاہدؔ رضوی، ظہیرؔ جعفری، آغا ہاجرؔ، باذلؔ عباس ضیغم، سائرؔ، ثاقبؔ، سعادتؔ نظر، عبدالحیؔ خاں، شارقؔ، بانوؔ سید پوری، نظیرؔ سیہوری، عقیلؔ نجمی، سہیلؔ آفندی، روپؔ کماری، بیدارؔ بھنی اور وفاؔ ملک پوری وغیرہ۔

ڈاکٹر نواز حسن زیدی لکھتے ہیں کہ تلامذہ کی اصلاح کے وقت نجمؔ آفندی کے ہاں وہی جذبہ کارفرما ہے جسے عشقِ اہل بیت کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تلامذہ کے کلام کی اصلاح کے لیے باقاعدہ اصول وضع کر رکھے تھے۔ شاگردوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے امید نہیں کہ جلد تمھارا کلام دیکھ کر بھیج سکوں گا۔ از روئے انصاف سلسلہ وار دیکھتا ہوں'' آج کل چار طرف سے پاکستان اور ہندوستان سے اصلاح کا کلام آ رہا ہے۔ سر اٹھانے کی مہلت نہیں۔ دماغ بھی کام دیتا ہے تو ہاتھ کانپتا ہے کس کس کو منع کروں اور کیسے ممکن ہے مدحِ اہل بیت کا مسئلہ ہے۔

مدت مشقِ سخن: تقریباً ستر (70) سال

مسافرت برائے شاعری: دہلی، کانپور، لکھنؤ، حیدرآباد، کراچی، کلکتہ، بنارس، لاہور ہی نہیں بلکہ دور دراز کے چھوٹے مقامات پر بھی تبلیغ پیامِ اہل بیت میں مشغول رہے۔ چنانچہ فیض آباد، بریلی، بارہ بنکی، سیتا پور، بھرت پور، اجین، مدراس اور بلرام وغیرہ کے لوگ بھی موصوف کے کلام کے دلدادہ رہے۔

زیارت عتبات عالیہ: 1950ء اگست میں زیارتوں کے لئے عراق گئے اور مختلف مقامات مقدسہ پر حاضری دی اور اپنے تاثرات کو منظوم لکھ کر ''تاثرات زیارت'' کے عنوان سے شائع کیا۔

تصنیفات: راقم کو کائنات نجمؔ آفندی مرتب کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نجمؔ آفندی کی تصانیف تقریباً عنقا ہیں۔ نجمؔ آفندی کی چالیس (40) سے زیادہ تصانیف شائع ہوئیں۔ سب سے پہلی تصنیف ان کے کلام کا مجموعہ 1917 میں اور آخری تصنیف

''لہو قطرہ قطرہ'' ان کے انتقال کے چار سال بعد 1979ء میں شائع ہوا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ تجمّم آفندی نے حیات میں چند تصانیف مرتب کی تھیں مثلاً ''گلدستۂ نعت'' ''مذہبی رباعیات'' ''قومی اور مذہبی نظموں کا مجموعہ'' ''خود نوشت سوانح حیات'' جو نامکمل رہ گئی تھی جو کبھی شائع نہ ہوئیں۔ نیز تجمّم کے مضامین کا کوئی مجموعہ بھی ترتیب نہیں دیا گیا۔

تجمّم مرحوم کی تصانیف کی فہرست جو ضمیر اختر نقوی نے مرتب کی ہے یہاں پیش کی جارہی ہے۔ باضافہ چند تصانیف جو بعد میں شائع کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
1.	پھولوں کا ہار	1917ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	پہلا مجموعہ کلام۔ ادبی، اخلاقی قومی نظموں کا مجموعہ وہ نظمیں جو شیعہ کانفرنس میں پڑھی گئی تھیں۔
2.	قصائد تجمّم	1943ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	رباعیات (32) قصائد اور نظمیں (25)
3.	تہذیب مودّت	1943ء	تاج پریس، یوسف آباد، حیدرآباد	رباعیات (140)
4.	اشاراتِ غم حصہ اول	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (32) نوحے
5.	اشاراتِ غم حصہ دوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (33) نوحے
6.	اشاراتِ غم حصہ سوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (21) نوحے
7.	کربلا کی آہ	——	کتب خانہ اثنا عشری، لکھنؤ	جدید نوحہ جات (9) نوحے
8.	آیاتِ ماتم	1361ھ	نظامی پریس، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض
9.	تصوراتِ غم	1943ء	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.10	کربل نگری	1361ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی پر لکھی گئی نظم (اردو۔ ہندی)
.11	اسلام پوتھی	1380ھ	امامیہ مشن لکھنؤ	طویل مثنوی، آغاز اسلام سے ہجرت حبشہ تک (اردو۔ ہندی)
.12	فتح مبین	1943ء	نظامی پریس لکھنؤ	ایک مرثیہ۔5 سلام، 9 رباعیات
.13	بیاضِ عجم	1950ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی	نوحہ جات، (حصہ اول، 53 نوحے، حصہ دوم 81 نوحے)
.14	شاعرِ اہل بیتؑ جیل میں	1939ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	قومی نظموں اور قطعات کا مجموعہ
.15	حسینی منسار	1364ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحہ جات
.16	کاروان ماتم	———	کتب خانہ اثنا عشری لاہور	(54) نوحے اور سلام
.17	پریم بھکتی	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	ہندی نظموں کا مجموعہ، اردو رسم الخط میں
.18	دارالسلام	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	جدید رنگ کے سلام
.19	تاثرات زیارت	1950ء	الکٹرک پریس، حیدرآباد	زیارت سے متعلق منظوم خراج عقیدت

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.20	نصاب دینیات	1364ھ	مطبع حیدری، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر دینی احکامات (نثر)
.21	شہیدوں کی باتیں	1952ء	رضا کاربک ڈپو، لاہور	کربلا والوں کے اقوال اور کارنامے (نثر)
.22	حسینؑ اور ہندوستان		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	ہندوستان کا امام حسینؑ سے روحانی تعلق (نثر)
.23	لغات المذہب	1961ء	رضا کاربک ڈپو، لاہور	ایک ہزار مذہبی الفاظ پر مشتمل لغت (نثر)
.24	چورا ماموں	1349ھ	زاویہ ادب، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر اخلاقی افسانہ (نثر)
.25	چاند کی بیٹی	—	—	—(نثر)
.26	پھول مالا	—	—	—(نثر)
.27	معراج فکر	1959ء	رضا کاربک ڈپو، لاہور	مرثیہ
.28	اسرار وافکار	1971ء	ادارۂ قدر ادب، حیدرآباد	چار سو رباعیات وقطعات
.29	قصائد نجم	1372ھ	تاج پریس، حیدرآباد	سولہ (16) قصائد کا مجموعہ
.30	جانِ کربلا	1993ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.31	معرکۂ غم		مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.32	دکھ کا ساگر		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.33	کاروانِ عزا	———	عزادار بک ڈپو	نوحے اور سلام
.34	ترقی کی برکتیں	———	———	——— (نثر)
.35	قصایدِ قدسی	———	مطبوعہ شمسی پریس، آگرہ	قصائد
.36	ستارے	1364ھ	دکن اُردو اکادمی	نظموں کا مجموعہ
.37	بندۂ خدا	1969ء	کاظمی پرنٹنگ پریس حیدرآباد	ایک مذہبی ناول (نثر)
.38	نفس اللہ	———	دائرہ الکٹرک پریس، حیدرآباد	——— (نثر)
.39	ترقی پسندوں کے نام	———	———	——— (نثری کتاب)
.40	رباعیاتِ نجم آفندی	———	امامیہ کتب خانہ لاہور	(145) رباعیات
.41	پنجتنی قصائد (غیر مطبوعہ)	———	———	قصائد
.42	رباعیات	1976ء	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد	(30) رباعیات
.43	لہو قطرہ قطرہ	فروری 1979ء	پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی	پچاس منتخب غزلوں کا مجموعہ

وطن پرستی اور انگریز نفرت: سچ تو یہ ہے کہ برصغیر نے علامہ نجم آفندی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور آزادی کے بعد ع: منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

وطن دوستی انگریز نفرت اور قومی محبت نجم آفندی کے ریشہ ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ذیل میں چند واقعات اور حکایات ہمارے دعویٰ کے ثبوت ہیں۔

1. ابتدائی عمر میں جب اسکول میں کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہونے کے بعد ان کے ہیڈ ماسٹر راج کمار کے جملہ ''تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے؟'' نے فوراً

انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اپنی خودنوشت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔''میرے دل نے آواز دی کہ تیسرے سے مراد انگریز ہے جس کی غلامی کی صعوبتیں ہم برداشت کررہے ہیں لیکن اس کو مار بھگانے کی جسارت نہیں کرتے۔''

2. نجم آفندی کی کھدر پوشی سے تنگ آکر ان کے انگریز افسر نے ان کا تبادلہ سزا کے طور پر آسنسول کردیا۔ چنانچہ بعد میں نجم نے تحریک ترک موالات سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لئے استعفےٰ دے دیا۔

3. انگریزوں کے استعمار سے بیزار ہوکر زمانہ طالب علمی میں ایک چھوٹی سی انجمن بنائی جس کا خفیہ ایجنڈا انگریزوں سے ان ہی کے ہتھیاروں سے مقابلہ اور قومی ملی یکجہتی تھا۔ اس انجمن کے ممبر ایک خاص قسم کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ انجمن رشتوں کے بھائی کی سازش سے ختم ہوگئی۔

4. سرکاری ملازمت سے علاحدگی کے بعد قومی اور مذہبی رجحان نے تقویت پائی چنانچہ ایک طویل پچیس(25) بند کی نظم ''دُرِ یتیم'' لکھی جو ''پھولوں کا ہار'' مجموعۂ کلام میں شامل ہے اور اس نظم کے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھا ہے کہ یہ وہی نظم ہے جس نے شیعہ کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں حشر برپا کردیا تھا اور جس پر راجہ سید ابوجعفر صاحب نے ساڑھے چار ہزار روپے نچھاور کردیے تھے۔

5. نجم آفندی نے اپنی تصنیف ''ترقی کی برکتیں'' میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قوموں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے طاقت ور بازوؤں کا صحیح مصرف کریں اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے فساد روک کر ملک کی سب سے بڑی خدمت کریں۔

6. نجم آفندی جلیس ترمذی کے خط میں لکھتے ہیں: ہندو قوم کے افراد نے گاندھی جی کو ختم کرکے دنیا کو یہ بتادیا ہے کہ ہندوستانی ذہنیت کہاں تک پست ہوسکتی ہے۔

7. نجم آفندی کانگریسی تھے اور اسی لئے کانگریسی مشاعرے بھی کروائے۔ ایک مشاعرے

میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کئے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام دیا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست برہم سروپ خارمیرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا۔ تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی درباداری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کردیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تناؤ کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ و ثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ کراچی میں چند مہینے قیام کر کے وہ لاہور گئے پھر کراچی آتے جاتے رہے۔ نجم صاحب محافل شعر و سخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں اور مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب،

شاعر اور خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یادداشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : ¾ 9 بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میت : وصیت کے مطابق مکان پر ہوا

نماز میت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : سخی حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبرآبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراقِ نجم نجم آفندی مرحوم
''غروب انجم نجم'' اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیضؔ بھرت پوری:

رحلت شاعرِ فنا فی اللہ
حجم آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحرؔ لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
حجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسرتیؔ منہاس:

دُریک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعرِ نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیساںؔ اکبرآبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغلِ سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلشؔ پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلش اب تو یوں
ہے لکھا غم حجم دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقرؔ امانت خوانی:

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے حجم ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق بہ تجمل — شاعرِ اہل بیتؑ جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم — نجم گئے ہیں باغِ جناں میں

1395ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مرجعِ کرم خسرو قلیمِ دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازشِ ملت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحیدِ زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے — نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت — بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395ہجری

تعداد کل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علامہ نجم آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209 بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
کل اشعار = (12799)			

علامہ نجم آفندی
کے
سلاموں کا مجموعہ

.1	نجم کے سلاموں کی آفاقی قدریں	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
.2	منتخب اشعار	(220) عدد
.3	سلام (مطبوعہ وغیر مطبوعہ)	(107) عدد
.4	کل تعداد اشعار	(1375)

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

نجم کے سلاموں میں آفاقی قدریں

اردو ادب میں سلام کوئی کی روایت تقریباً چار سو سال سے جاری ہے۔ سلام کی صنف ان اصناف شعر میں ہے، جو اردو ادب میں پھولی پھلی اور مشہور رہوئی۔ عربی زبان میں ایک جداگانہ صنف کے اعتبار سے سلام کا وجود نہیں ملتا، لیکن فارسی ادب میں کچھ اشعار بشکل سلام نظر آتے ہیں، جو ترکیب بند اور ترجیع بند میں کہے گئے ہیں۔ ہماری رثائی شاعری، جو سوز، سلام، مرثیہ اور نوحے جیسی اصناف پر مشتمل ہے، اس میں سلام کا تصور قرآن مجید میں سورہ الاحزاب کی آیت سے ماخوذ کیا گیا ہے، جس میں ارشاد خداوندی ہے کہ اے ایمان والو! جس طرح خدا اور اس کے فرشتے، پیغمبرؐ اور ان کی آل پر درود بھیجتے ہیں، تم بھی ان پر درود و سلام بھیجتے رہو۔ اردو ادب نے سلام برخواص کی روایت کو ایسا اپنایا کہ اردو شاعری میں سلاموں کا ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہوگیا، لیکن دوسرے رثائی اور مذہبی ادب کے ساتھ ساتھ کئی صدیوں تک یہ ذخیرہ بھی طاق نسیاں کی زینت بنا رہا اور اس کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ عربی اور فارسی کی طرح اردو ادب میں بھی عروضی ہیئتی تقسیم سے ہی مختلف اصناف بنائی گئی ہیں۔ جیسے غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مستزاد، ترکیب، بند، ترجیع بند وغیرہ۔ رثائی اور مذہبی ادب جس میں مرثیہ، سلام، نعت، منقبت، ہجو وغیرہ شامل ہیں، اس کو موضوعاتی تقسیم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی بحیثیت صنف، سلام اردو میں ایک موضوعی صنف سخن قرار پاتا ہے۔ امداد امام اثر نے ''کاشف الحقائق'' میں لکھا ہے کہ عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شے واحد ہے، مگر ان کے مضامین اور تقاضے ایک دوسرے سے علاحدہ انداز رکھتے ہیں۔ ان کے مختلف اشعار میں مختلف خیالات و مضامین نظم ہوتے ہیں اور ایک شعر کا دوسرے شعر سے معنوی اعتبار سے مربوط ہونا ضروری نہیں۔ جناب

امداد آثر نے یہ بھی بتلایا کہ سلام عروضی ترکیب رکھتے ہوئے بھی غزل سے علاحدہ ہوتا ہے چونکہ اس میں واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ پر رثائی رنگ غالب رہتا ہے اور سلام میں واقعہ کربلا، رحلت رسول اکرم ﷺ اور ذکر مصائب فاطمہؓ و ائمہ کا بیان ہوتا ہے۔ اگرچہ سلام کی تاریخ اور اس کے ارتقائی سفر پر کوئی خاص تحقیقی کام ابھی تک انجام نہ ہوسکا، لیکن سلام کے ابتدائی نمونے جو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ اردو سلام کوئی کا آغاز سرزمین دکن سے سولھویں صدی میں ہوا۔ قلی قطب شاہ، معانی، علی عادل شاہ ملا وجہی، ملا غواصی، عبدل بیجا پوری، رستمی بیجا پوری، ملک الشعرا ملا نصرتی بیجا پوری، سید باقی، امامی دکنی، دردی، درگاہ قلی اور سید ولی محمد دکنی کا چیدہ چیدہ کلام، جو ہماری دسترس میں ہے، اس میں سلاموں کی کثیر تعداد شامل ہے۔

ان شعراء میں درگاہ قلی کو خاص شہرت حاصل ہے جو سلام بشکل مربع لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں سلام کی ہیئت کا تعین نہیں تھا، چنانچہ بیشتر سلام مثلث، مخمس، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ ہیئتوں میں لکھے ملے ہیں، لیکن ان سلاموں کی پہچان یہ ہے کہ ان کے مطلع اور ردیف میں لفظ سلام، سلام علیک، علیک السلام مجرئی، فاتحہ وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے جو صنف سلام کو دیگر رثائی اصناف سے جدا کرتا ہے۔

معروف شاعر ولی دکنی جس کو محمد حسین آزاد نے شاعری کے باوا آدم کا لقب دیا ہے اور شمالی ہند کی شاعری جن کی مرہون منت ہے اور انھی کی دلی کی آمد و رفت نے دلی والوں کو صنف سلام کی طرف متوجہ کیا تھا جس کے نتیجے میں شمالی ہند کے مشہور رثائی شعرا مسکین، ہدایت، افسردہ، میاں سکندر، شاکر ناجی کے علاوہ ان کے بعد آنے والے مشہور شعراء ضاحک، سودا، میر تقی میر، مصحفی وغیرہ نے بھی سلام کی صنف کے دامن کو عشق آل محمد ﷺ سے سرشار کردیا۔ میر، سودا، اور ضاحک کے دور تک سلام کی ہیئت بشکل مفرد یا غزل تقریباً منظم ہوچکی تھی اور قدما کی تقلید کو برقرار رکھتے ہوئے صرف مطلع میں ایک بار لفظ سلام یا مجرئی وغیرہ کا استعمال لازم سمجھا جاتا۔ سلام کے ارتقاء کا دوسرا دور دلی میں شاہ ظفر، ظہیر، غالب، مومن، ذوق، سالک، عارف، باقر شہید اور لکھنؤ میں ضمیر، خلیق، فصیح، دلگیر، اور ناسخ کا تھا۔ اس دور میں تقریباً ہر بڑے شاعر نے سلام کہے اور ان سلاموں میں تغزل کا رنگ اور منقبت کی چھاپ بھی نظر آنے لگی جو عقیدت، محبت اور

تصوف کی بلندیوں سے حاصل ہوئی۔ سلام کوئی کا تیسرا اور سنہرا دور مرثیے کے سنہرے دور سے ملا ہوا ہے۔ یہ دور میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا عہد شاعری تھا، جس میں سلام صرف واقعات کربلا پر محور کرتا ہے۔ اس دور میں سلام صرف غزل کی ہیئت پر لکھے گئے اور کچھ عرصے بعد مطلع میں لفظ سلام، سلامی، مجرئی، مجرا، سلام علیک جیسے الفاظ کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے بعد ان کے شاگردوں جن میں عارفؔ، نفیسؔ، اوجؔ، وحیدؔ، منیرؔ، نظیرؔ، عروجؔ اور بیسویں صدی کے ابھرتے شاعروں نے سلام کے دامن کو تغزل اور منقبت کے رنگ سے گہرا تو کیا اور سلام میں عقیدتی اشعار کے ساتھ سماجی، اخلاقی، اور انقلابی، اشعار بھی داخل کیے لیکن انیسؔ اور دبیرؔ کی بنائی ہوئی حصار سے باہر نکل نہ سکے۔ امیرؔ مینائی، اسیرؔ اور نواب داغؔ نے سلام کو مسدس کی شکل میں کہنے کی کامیاب کوششیں کیں، لیکن اس کی تقلید نہ ہوسکی۔ دور جدید کے شعرا جن میں جوشؔ ملیح آبادی، آلؔ رضا، نجمؔ آفندی، ماہرؔ القادری، احسانؔ دانش، جمیلؔ مظہری وغیرہ نے ادب برائے زندگی کو اپناتے ہوئے سلام کو اپنی عقیدت اور انقلابی پیام کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی اور یہ کوشش آج بھی جاری ہے۔ بقول محمد علی جوہر:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

سلام نگاری کی روایت، تاریخ، ہیئت کے مختصر جائزے کے بعد ہمیں اس اہم صنف سخن کی اقدار پر بھی مختصر سی روشنی اس لئے ڈالنی ہے کہ نجمؔ آفندی کی سلام نگاری انہی آئینوں میں جلوہ افروز ہوگی۔ جہاں تک سلام، ایک مستقل صنف سخن کا تعلق ہے، تقریباً تمام علمائے ادب اور خصوصی طور پر علمائے رثائی ادب نے اس کی تردید اس لئے نہیں کی کہ اس کے وجود میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہ تھی اور سلام پر جیسا کہ ہم آئندہ صفحات پر بیان کریں گے، خاطر خواہ، بلکہ ابتدائی کام بھی نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹر سید عباس رضا نے ڈاکٹر شارب ردولوی کے بیان ''سلام کا ارتقا مرثیے کی ایک ضمنی صنف سے ہوا اور چونکہ اس کا مقصد سوز یا مرثیہ خوانی سے پہلے پیش خوانی کا تھا، اس لئے وہ علاحدہ ایک صنف کی حیثیت سے سے ادب میں کوئی نمایاں مقام نہیں بنا سکا'' کی تردید کرتے

ہوئے لکھا کہ صنف سلام نے اردو شاعری کے اولین دور میں ہی اپنی حیثیت منوالی تھی، اسی باعث ابتدائی شعرا نے اس صنف کو اپنے افکار ونظریات سے مالا مال کر دیا تھا۔

راقم کی نظر میں یہ درست ہے کہ سلام کی ابتدا مرثیہ کی ضمنی صنف کی حیثیت سے ہوئی، لیکن اب سلام اپنی آپ شناخت بنا چکا ہے اور اردو کی کئی دوسری اصناف سے زیادہ معتبر، ممتاز، مقبول اور مشہور ہے۔غزل کی ہیئت سے ہمکنار ہوتے ہوئے بھی، اپنی خاص پہچان رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے پاکیزہ موضوعات، جو مرثیہ میں تسلسل کی وجہ سے کثیر تعداد میں بیان نہیں کئے جاتے، وہ سلام میں ہر شعر میں بیان ہوتے ہیں، اسی لئے سلام کے موضوعات کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس میں اگرچہ عموماً اخلاقیات کے آبدار اشعار، جو عجز و انکساری، توکّل و قناعت، سخاوت ومہمانداری، شجاعت و امانت داری کے علاوہ حسن عمل کی تاکید وتعریف میں ملتے ہیں، لیکن غزل کی طرح اس میں مذہب، عشق، فلسفہ، منطق، حیات اور ممات کے مسائل کے ساتھ ساتھ جمالیاتی احساسات کی فراوانی نظر آتی ہے۔مقطع میں شاعر داخلی قلبی واردات، اعتقادی تفکرات اور خارجی روداد کو بھی شامل کر دیتا ہے۔موجودہ دور میں مرثیہ کا انحطاط سلام کے ارتقا سے رثائی ادب کو میزان کر رہا ہے۔عمدہ اور عالی اقدار اور محاسن سے لبریز سلام لکھے جا رہے ہیں اور اِس موقع اور مقام پر سلام سے شناختی کارڈ کا مطالبہ کسی ملک میں اس کے حکمران عالی پریسیڈنٹ سے ائیر پورٹ پر پاسپورٹ پوچھنے کے مماثل ہوگا۔ہم سلام کی اس گفتگو کو سلام کر کے تجم کے عالی سلاموں کی تخلیق نگاری کو سلام کرتے ہیں اور غالبؔ کے لہجہ میں سلام گویوں کو ع:

''تم سلامت رہو ہزار برس'' سلامتی کی دعا کرتے ہوئے سلام کے دروازے کو کھولتے ہیں۔

کوئی پندرہ سولہ سال پرانی بات ہے، میرے غریب خانہ واقع نیویارک میں رثائی ادب پر گفتگو کے درمیان ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ میں سلام کی صنف پر تحقیقی کام کروں، کیوں کہ اردو ادب میں اس پر تقریباً کام مفقود ہے جبکہ اس پر غضب کا مواد موجود ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دو تین جملوں کا اثر مجھ پر شدید اور پُرکار ثابت ہوا اور میں نے اس صنف کے مسائل کی کھوج میں کئی اہلِ ادب سے گفتگو کی اور رثائی ادب کے سلاموں کے مجموعوں کو کھنگالا تو معلوم ہوا کہ جناب علی جواد زیدی کا سلام کے ارتقاء پر مضمون سب سے مستند

مضمون ہے جس کے اشارات انھوں نے انیسؔ کے سلاموں کے مجموعہ میں بھی منتقل کیے ہیں اور اسی مضمون کے چہرے مختلف سلاموں کی کتابوں اور مرثیوں کی بیاض میں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور عمدہ مضمون سلام کی تاریخ اور فنی حیثیت پر جناب سعادت رضوی کا ہے جو شہید یار جنگ کے سلاموں کے مجموعہ میں دیباچہ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ان دو عمدہ مضامین کے علاوہ کوئی اور تحریر میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ پروفیسر گیان چند جو آج کل کیلیفورنیا امریکہ میں مقیم ہیں اور علیل و فریش ہیں، مجھے تقریباً دس سال قبل بتایا کہ 1950ء اور 1955ء کے درمیان شمالی ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے طالب علم نے سلام پر ایک دو سو ڈھائی سو صفات پر مشتمل مقالہ لکھا تھا، جو ان کی نظر سے گزرا لیکن کبھی شائع نہ ہوا، مزید اطلاعات نہ ہونے کی وجہ سے میرے لئے اس مقالے کا پتہ لگانا ممکن نہ تھا۔ بہرحال گذشتہ سال میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے ڈاکٹر سید عباس رضا استاد شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ، لاہور کا ضخیم تحقیقی مقالہ، جو اردو پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے ڈاکٹر سہیل احمد خاں ڈین آف آرٹس گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی نگرانی میں بعنوان ''اردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری جائزہ'' 2004ء میں مسودہ کی شکل میں دیکھا۔ یہ مقالہ جو بڑے سائز کے 400 صفحات پر مشتمل ہے، آج تک کی مطبوعہ تحریروں سے ہر لحاظ سے قابل قدر اور مستند ہے۔ اس میں پانچ ابواب میں سلام کے فنی مباحث، ہیئت خصوصیات، تاریخی اور فکری مطالعات، پاکستان کے قیام سے قبل اور بعد کے سلام پر اثرات کا مجموعی جائزہ شامل ہے۔ جہاں تک تجمّل آفندی کے سلاموں کا تعلق ہے، اس مقالے میں ان کے شایان شان مطالب شاید اس لئے نہیں جمع ہو سکے کہ تجمّل کا کلام آسانی سے دستیاب نہ تھا۔ اب جبکہ کائنات تجمّل منظر عام پر آ چکی ہے، اس مقالے میں یہ کمی پوری ہو سکتی ہے۔ بہرحال سلام نگاری پر ڈاکٹر سید عباس رضا، تجمّل فکر و فن پر ڈاکٹر نواز حسن زیدی، تجمّل کی شخصیت پر ڈاکٹر ریاض فاطمہ اور انجم پر جناب باقر زیدی ہمارے خلوص و محبت کے مستحق اور حق دار ہیں۔

مشہور تاریخی واقعہ ہے جب مہاتما گاندھی سے کسی مغربی خبر نگار نے اہنسا (Nonvcilence) کے بارے میں پوچھا تھا کہ یہ کہاں سے سیکھا تو گاندھی جی نے جواب دیا، اہنسا اور حق پر جان دینا نواسۂ رسول حسینؑ سے سیکھا۔ بس معلوم ہوا کہ پیام حسینؑ صرف مسلمانوں

کے لئے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لئے ہے۔نجم نے شعورحریت کا سلاموں کے ذریعہ سبق دیا ہے۔

اگر انساں کو عرفانِ غم شبیرؑ ہوجائے　　شعورِ حریت دنیا میں عالم گیر ہوجائے

جو حریت کی راہ بتاکر گئے حسینؑ　　راہیں نکل رہی ہیں اُسی شاہراہ سے

کیوں اس کی یادگار منائیں نہ اہلِ دل　　جذباتِ حریت کا جو پروردگار ہو

یہ حریتِ فکر یہ بیداریٔ اقوام　　اک کوششِ تقلید حسینؑ ابن علیؑ ہے

میدان کربلا کو اپنا لہو پلاکر　　دنیا میں حریت کا مرکز بنا رہے ہیں

ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی　　الفاظ ہیں کہ ساری دنیا پہ چھا رہے ہیں

چاند نے زہراؑ کے مستقبل کو درخشاں کر دیا　　قومیت کی روح آزادی کو جولاں کردیا

جہاں تک پیغام حسینؑ کی تبلیغ اور تشہیر کا تعلق ہے،نجم کی شاعری ادب برائے ہدف بن جاتی ہے لیکن اس شاعری میں واعظانہ لہجہ نہیں،نصیحت اور پند نہیں، بلکہ جمالیاتی حس کے ساتھ ساتھ جذبات اور احساسات کو مہمیز کرنے کی محاکاتی دھیمی روش ہے، جو احساسات کے باریک تار کے ذریعہ قلب میں اتر جاتی ہے اور پھر ذہن روشن ہوجاتا ہے۔سلام میں اس طرح کے مضامین اس انداز میں نجم سے پہلے اس شدت سے نظم نہیں ہوئے، اگر چہ نجم کے بعد دبستانِ نجم کے دانش آموز ان کے نقوش پر نقش جماتے رہے۔اگر اردو شاعری میں ان انسانی اقدار کی ترتیب اور نشو ونما شدید ملتی ہے تو وہ علامہ اقبال کا کلام ہے۔علامہ نے اگر چہ کوئی سلام نہیں لکھا، لیکن دیگر اصناف میں انہی مطالب کو استعارہ کے طور پر پیش کیا ہے۔نجم آفندی، نہ غم دوراں کے مارے

ہوئے تھے اور نہ غم جاناں کے شہید، بلکہ دولتِ غمِ حسینؑ سے سرشار تھے اور اس لذتِ غم سے دوسروں کو آشنا کرتے رہے۔ اسی غم کو تمام مشکلات اور زندگی کے مکافات کا حل جانا۔ یہ غم ایک طرف عدل و مساوات، حریت وعدالت، عزم و استقلال، حق گوئی، اخلاق و کردار سازی وغیرہ کی نشوونما کرتا ہے، تو دوسری طرف عبدیت کے رشتوں کو گہرا اور رنگین بناتا ہے۔ اس کٹھن مضمون میں آبدار اشعار کی چمک دیکھئے جس سے روح کے گوشے روشن ہوتے ہیں۔

نکھرتے ہیں غمِ شبیرؑ سے اخلاقِ انسانی　　یہی غم ہے کہ جس سے زندگی کی آبیاری ہے

نہیں یہ شان کسی درد کے فسانے کی　　غم حسینؑ میں قدرت ہے دل بنانے کی

یہ اک ادنیٰ سی کرامت ہے غمِ شبیرؑ کی　　آدمی انسان بنتا ہے غمِ شبیرؑ سے

غمِ حسینؑ ہے یوں فکر پر اثر انداز　　خود اپنے دل کو بھی اپنے سخن کی تاب نہیں

تربیت کی ذہنِ انساں کی غمِ شبیرؑ نے　　صاحبِ دل بن گئے جو غم کے خوگر ہوگئے

پھر جائیں دن جو ذوقِ عمل بھی نصیب ہو　　اب تک غمِ حسینؑ بحد خیال ہے

سب سے عظیم حُسنِ عمل ہے غمِ حسینؑ　　کتنی مخالفت ہو، اٹل ہے غمِ حسینؑ

اس غم کے ساتھ فکر ونظر بھی جو ہو نصیب　　ہر عقدۂ حیات کا حل ہے غمِ حسینؑ

نجم غمِ حسینؑ سے عزّتِ نفس کی بالیدگی چاہتے ہیں، وہ غمِ حسینؑ سے حُسنِ عمل کی کارکردگی کے مشتاق ہیں۔ وہ غمِ حسینؑ کے متعلقات یعنی مجلس، منبر، ماتم، جلوس وغیرہ میں نمائش کے عوض قلبی واردات کے منتظر ہیں اور یہاں ان کا لہجہ کھرا اور صاف ہے کیوں کہ یہ ایک ماموریت ہے

جو شاعر اہل بیتؑ نے اپنے سر لی ہے۔

کیا مالکِ اشتر نے جھنجھوڑی ہیں صفیں
ہر جنگ میں صاف کر کے چھوڑی ہیں صفیں
تیرے لیے ہے نفس کا میدان جہاد
کچھ تو نے برائیوں کی توڑی ہیں صفیں

خبر بھی ہے تجھے ہمنامِ عباسؑ
کہ ساتھ اس نام کے شرطِ وفا ہے

کربلا دے مجھے معیارِ عمل کی توفیق
کل جو تھا بس وہی موضوعِ فغاں آج بھی ہے

حق پرستی خود شناسی ہمت و عزم و عمل
مل کے ان اجزا سے بنتی ہے تولا اے حسینؑ

اب ہم میں نہیں جذبۂ انصارِ حسینؑ
اپنی تھی جو منزل ہوئی جاتی ہے پرائی

اقوالِ حسینیؑ ہیں عمل غیر حسینیؑ
یہ دین کے الفاظ میں دنیا طلبی ہے

کیا یہ ہے زندگی کا نصب العین
یہ ہے تقلیدِ سیّد کونین

دل دکھاتے رہو غریبوں کا
اور کہتے رہو حسینؑ حسینؑ

اللہ وہی قوم ہو سب سے پیچھے
جس قوم میں ہو معرکۂ کرب و بلا

مولاؑ کا ہر اک معرکۂ علم و عمل
سنتے رہے ہم درود پڑھنے کے لئے

کیا صرف کتابوں کے الٹتا ہے ورق
دنیا کا ورق بھی یا علی کہہ کے الٹ

عالم ہے تو قرآن پہ عامل بھی ہو　　خاکِ در اہلِ بیتؑ منزل بھی ہو

تجمل آفندی اپنے کلام، خصوصی طور پر اپنے سلام میں قومی افراتفری، بے حسی، بے عملی اور اقدار عالیہ کی کمی کو ظاہر کرتے ہوئے اخوت، حُسنِ عمل، محنت اور محبت کی دعوت اس طرح دیتے ہیں کہ سننے والے کو پند و نصیحت معلوم نہ ہوتا اور اس طرح قومی تعمیر خود بہ خود داخلی انقلاب کی طرح قوم کے دل میں پیدا ہو جاتی۔ ان کا انداز جمالیات، جذبات اور احساسات سے لبریز تھا۔ اسی لیے تو کہا تھا:

شعر و سخن میں تجمل یہ ہیں بے نیازیاں　　بیٹھا ہوں اجتہاد کی قوت لئے ہوئے

تجمل مجلس حسینؑ سے انسانیت سازی کا کام لینا چاہتے تھے۔

یہ مجلسِ غم ظلم مٹانے کے لیے ہے　　دنیا کو رہِ راست دکھانے کے لیے ہے
انسان کو انسان بنانے کے لیے ہے　　محدود نہیں سارے زمانے کے لیے ہے

یہ مجلس نہیں پیمان ہیں اطاعت کے　　یہ ہم حسینؑ سے قول و قرار کرتے ہیں

سینہ پہ کائنات کے نقشِ دوام ہے　　انسانیت حسینؑ کے اُسوہ کا نام ہے

عزم خالص چاہیے حُر کے ارادے کی قسم　　بڑھ گیا آگے تو پیچھے ہٹ گئی تقدیر بھی

دو گام چلے تو کوئی عباسؑ کے مانند　　کاندھے پہ بھری مشک ہے اور تشنہ لبی ہے

روز عاشور امام حسینؑ نے ایک عصر نو کی تعمیر کی ہے۔ یہ مطلب تجمل کے سلاموں میں مختلف انداز اور مختلف معانی میں نظر آتا ہے۔

پڑھ کر نماز عصر کی شبیرؑ زیرِ تیغ　　اک عصرِ نو کی خلق میں تعمیر کر گئے

خونِ شبیرؑ کا اسلام کی بنیاد میں ہے　　ایسی محکم نظر آئے گی نہ تعمیر کوئی

قربان ایسی موت کے جو خود ہو زندگی　　پیمانۂ حیات ہے پیمانِ کربلا

شبیرؑ سیاست کا وہ قائدِ اعظم ہے　　قانون بنا ڈالا عاشور کو دن بھر میں

کیا خون سے رونق ہے انصارِ حسینؑ میں　　رخسارِ شہادت پر اک تل نظر آتا ہے

اے کربلا کے خالق عزم و عمل نے تیرے　　کتنا بڑھا دیا ہے معیار آدمی کا

یہاں تحفظِ انسانیت کا ہے یہ سوال　　زبانِ سبطؑ نبی پر سوال آب نہیں

تجمّ آفندی کے کلام میں برادری، اخوت، مساوات کا درس ملتا ہے۔ وہ برادری، برابری، محبت اور اخوت صرف ملّت اسلامیہ کے فرقوں کے درمیان ہی نہیں، بلکہ دنیا کی اقوام کے مابین دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا ہیرو اگرچہ اسلامی اقدار کا نمائندہ ہے۔ لیکن وہ انسانیت کا پیامبر ہے۔ وہ آدمی گر ہے اس خلقِ عظیم کا پیکر ہے۔

سرکارِ دوجہاں کی محبت کے نام پر　　آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے

نام کس کا اتحادِ ملّت اسلام ہے　　ہم سے پوچھو وہ حسینؑ ابن علیؑ کا نام ہے

اسلام پیامِ امن ہے یاد رہے　　سنّی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو

ضرورت ہے محبت کی سبق نفرت کا پڑھتی ہے　　کہیں دنیا میں کوئی قوم یوں پروان چڑھتی ہے

یہ مصرف علم کا ہے اور یہ عالم نوجوانوں کا　　تعصب بڑھ رہا ہے جس قدر تعلیم بڑھتی ہے

وہ فرض پنجگانہ ہو یا ہو صلوٰۃِ عید ملتی ہے ہر نماز سے تعلیمِ اتحاد

ایک اور ایک دو بھی ہوتے ہیں ایک اور ایک مل کے گیارہ بھی

جن کو قدرت نے دی ہے عقلِ سلیم ان کو کافی ہے اک اشارہ بھی

ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی، نجم آفندی۔ فکر و فن، مطبوعہ لاہور 2000ء کے صفحہ 274 پر لکھتے ہیں:

میر مونس اور مابعد کے سلام نگاروں نے اپنے سلاموں میں اپنے عہد کے شعرا پر بھی چوٹیں کیں اور غیر شیعہ مسلمانوں کی بھی ہجو کی مثلاً:

بھلا تر ڈو بے جا سے اس میں کیا حاصل اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو (مونس)

غیر کی مدح کروں شہؑ کا ثنا خواں ہوکر مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر (انیس)

نجم کے ہاں اس حوالے سے متشددانہ انداز پایا جاتا ہے۔ نجم آفندی کے اس رویے کے پس منظر میں اس ماحول کی تلخی بھی ہے اور نجم آفندی کی اپنی مخصوص طبیعت بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز امپیریل ازم سے نفرت کے باعث انھوں نے ہر اس شخص کی مخالفت کرنا اپنا فریضہ بنالیا تھا جو یا تو خود تخت و تاج و طبل و علم کا وارث تھا یا کسی حوالے سے شہنشاہیت کو پسند کرتا تھا۔ نجم آفندی نے اہل بیتؑ کی قربانی کو شہنشاہیت کے خلاف ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ ان کے نزدیک اہل بیتؑ سے عقیدت جزو ایمانی ہے لیکن اس عقیدت کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے سلاموں میں ایسے ہی افراد کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا ہے جو اس عقیدت کے تقاضوں سے بے بہرہ ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار درج ہیں:

جو بعنوانِ تجارت ہو محبت کیسی کتنے مجلس میں بھی جنت کے خریدار آئے

چھوڑ کر عترت کا داماں کیا مسلماں لے گئے روحِ قرآں چھوڑ دی الفاظ قرآں لے گئے

روؤ کثرت سے ہنسو کم، حکمِ قرآنی یہ ہے   آپ قرآں دربغل اور دور ہیں قرآن سے

قرآن جس میں اُترا ہے وہ گھر نہ ڈھونڈ لیں   تفسیر ڈھونڈتے ہیں جو قرآن کے لئے

دعویٰ ہے دوستی کا غلط اہلِ بیتؑ سے   دشمن کا اہلِ بیتؑ کے دشمن اگر نہیں

ہم نے لفظ بہ لفظ اقتباس ڈاکٹر زیدی کا اوپر اس لئے دیا ہے کہ تجم پر انصاف ہو سکے۔ کیوں کہ اوپر دیے گئے مطالب کے جواب میں ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔لیکن ہمیں صرف ایک ہی صفحہ میں معروضات پیش کرنا ہیں ۔ اس لئے نقروں، تشفی بخش اشاروں، مستند حوالوں اور منطقی سوالوں سے جواب مناسب ہوگا۔

1. میر مونسؔ کا پورا کلام مطبوعہ چھ جلدوں میں راقم کے پاس نول کشور کے پہلے ایڈیشن 1896ء موجود ہے۔میری نظر سے سلام کا کوئی شعر جو غیر شیعہ مسلمان کی ہجو میں ہو،نہیں گزرا۔
2. جن دو شعروں سے مونسؔ اور انیسؔ کے مثال دی گئی ہے، اس میں اولاً ہجو کا پہلو نہیں، بلکہ شاعرانہ چشمک ہے۔ثانیاً یہ سلام جس میں رعایا سے لے کر بادشاہ واجد علی شاہ اخترؔ نے بھی شعر کہے تھے، انیسیوں اور دبیریوں کے درمیان ایک ادبی معرکہ آرائی تھی اور اس میں شیعہ سنی جھگڑا نہ تھا۔طرفین ایک ہی عقیدے کے افراد تھے۔اس سلام پر کامل روداد رثائی ادب کے رسالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی دیکھی جاسکتی ہے۔
3. میر مونسؔ اور مابعد کے سلام نگاروں ...... یہ اعتراض خود قابل اعتراض ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سے شعرا ہیں جنھوں نے سلام جو سلامتی، دعا، اور اقدار اسلامیہ کی پاک ترین صنف ہے، اس میں ایسے اشعار لکھے ہوں۔راقم، سلام نگاری کا طالب علم ہے اور اس طرح کے سلاموں سے بے خبر ہے۔بہر حال اولاً اگر بالفرض کسی منچلے نے ایسا قدم کیا ہو تو وہ نظم، سلام نہیں کہلاتی۔سلام میں دل آرائی، قلب سازی اور سلامتی کا درس ہے۔دل آزار نظموں کو سلام کہنا نا انصافی ہے۔بہر حال گفتگو تو جب ہوگی جب ثبوت کے طور پر

سلام نگار شعرا کے شعر پیش ہوں۔

4. ''نجم کے ہاں اس حوالے سے متشددانہ انداز پایا جاتا ہے۔'' یہ جملہ اُس حوالے سے کہ شعرا نے غیر شیعہ مسلمانوں کی بھی ہجو کی۔ نجم پر سراسر الزام ہے۔ راقم، دنیا ے اردو ادب کا وہ واحد شخص ہے جس نے پہلی بار ان کے تمام تر کلام، جس میں 12752 اشعار شامل ہیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر کائنات نجم میں جمع کیے مجھے ایک بھی شعر غیر شیعہ مسلمان کی ہجو میں نہیں ملا جو پانچ اشعار اس دعوے کے ثبوت میں پیش ہوئے اس میں تین شعر قرآن اور عترت، ایک شعر دشمنِ اہل بیتؑ سے برأت اور ایک شعر مجلس میں شرکت کرنے والوں سے منسوب ہے۔

5. مجلس کے شرکا تقریباً تمام تر شیعہ لوگ ہوتے ہیں اور پورے شعر کا رجحان، جس میں اہل بیتؑ سے محبت کا دعویٰ اور مجلس کو تجارت کا ذریعہ بنانا، صریحاً غیر شیعہ مسلمان سے خطاب نہیں۔ اگر کائنات نجم کا مطالعہ ہو تو صدہا اشعار نجم کے محبانِ اہل بیتؑ اور خطیبوں کے رجحانِ عزاداری کے خلاف ملیں گے۔ نجم شاعر اہل بیتؑ تھے ان کی نظر میں مسلمانوں کے صرف دو گروہ ایک محبّ اہل بیتؑ اور دوسرے دشمن اہل بیتؑ تھے چنانچہ شیعہ سنّی وہابی دیو بندی وغیرہ کی تفریق نہیں۔ وہ اپنے کلام اور سلام میں موڈبانہ اور طنزیہ اسی فرقہ کے افراد کو موردِ سوال قرار دیتے تھے جو ان ہی کے مسلک سے تھے۔

6. جہاں تک قرآن اور عترت کا سوال ہے۔ نجم تمام بلادِ اسلامیہ کی مانی گئی معتبر حدیث ''ثقلین'' کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اے مسلمانو! میں تم میں دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک کلام اللہ اور دوسرے میری عترت۔ تم ان دونوں سے متمسک رہو، کیوں کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں گے۔ چنانچہ نجم نے جو اس حدیث کو نظم کر کے اس کے ساتھ رہنے کی ہدایت کو ظاہر کیا اور اس سے دوری پر طنز کیا، وہ بالکل صحیح ہے۔ اگر اس کو دل آزاری اور ہجو تسلیم کیا جائے تو حضورؐ سب سے پہلے اس کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ بہر حال نجم حق گو تھے، حق پرست تھے، وہ حق کی بات جو قرآن اور حدیث میں ہو، اسے

کہنے کو عار نہیں سمجھتے تھے۔

7. اگر قرآن میں آیا ہے کہ رووٴ کثرت سے اور ہنسو کم، تو جو لوگ رونے پر اعتراض کرتے ہیں تو قرآن سے اس کا مدلل جواب ہجو نہیں کہلاتا۔ تجمّل نے تو اس انداز سے نہیں کہا جیسا ایک ہندو شاعر ماتھر لکھنوی نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا؟

اپنا کوئی مرتا ہے تو روتے ہو تڑپ کر　　اور سبطِ پیمبرؐ کا کبھی غم نہیں کرتے
ہمت ہے تو محشر میں یہ پیغمبرؐ سے کہنا　　ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

8. حق اور باطل دونوں کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ آیت قرآنی ہے حق آیا اور باطل چلا گیا۔ ع: دیو چوں بیرون رود، فرشتہ در آید'' اہل بیتؑ کے دوست ہو کر ان کے دشمن سے دوستی نہیں رکھ سکتے۔ یہ شعر کسی خاص فرقہ پر نہیں۔ اس سے سخت شعر تو شورشؔ کاشمیری نے کہے تھے:

جن ظالموں نے ظلم کیا اہلِ بیتؑ پر　　قہرِ خدا سے ان کو بچایا نہ جائے گا
سن لیں مری طرف سے یزیدانِ عصرِ نو　　پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

9. یہ بھی شاید صحیح نہ ہو کہ تجمّل، اہل بیتؑ کی محبت کو شاہی کے خلاف سمجھتے تھے۔ خود تجمّل نے بیس بائیس سال دربار میں گزارے۔ دربار رُو دربار، صدق جائسی کی کتاب میں تجمّل کی خودداریاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اپنی متفرق نظموں میں واجد علی شاہ اختؔر پر عمدہ نظم لکھی۔ انھیں شاہی اور حکمرانی سے بیر نہ تھا، اگر وہ عدالت اور مساوات کے ساتھ رعایا کے حق کی پامالی نہ کرے، لیکن وہ اپنی روش اور خودداری کو بدلنا پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ خیالِ خام ہے کس کم نظر کج فہم کا
مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

کیونکہ

پرسشِ احوال پر جز شکر کچھ کہتے نہیں
بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

اسلامی تاریخ گواہ ہے جمہوریت اسلامی ممالک میں صدیوں سے مفقود ہے۔ لیکن اسلامی

اقدار جو جمہوری ہیں، وہ ہمیشہ کم مگر باقی رہے، اسی لئے تجمل اور دوسرے رثائی ادب کے شعرا نے ان اقدار کا ذکر خیر کیا ہے۔ انگریز امپیریل ازم کے باعث انھوں نے ہر اُس شخص کی مخالفت کو اپنا فریضہ بنالیا اور اہل بیتؑ کی قربانی کو شہنشاہیت کے خلاف ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا، ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اقتدار کے لوگ امرایت اور سرمایہ دار اور مولوی نما ساہوکار اپنی ذاتی منفعت کے لئے اگر ان کے مخالف تھے، تو اس سے ان کے مشن پر کوئی اثر نہ پڑ سکا۔

تجمل کیا روکے گی یہ دنیا مجھے
میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

10. آخر میں ہم یہی کہنا پسند کریں گے جو خود ڈاکٹر نواز حسن زیدی نے اسی کتاب کے صفحہ 184 پر کہا ہے۔

''تجمل آفندی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کسی رباعی میں بھی ایسی بات نہیں کہی جو قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو۔ ان کے نزدیک عقیدت کا معیار یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے مسلمہ معیارات کو سامنے رکھ کر حضورﷺ کی مدح کی جائے اور صحیح روایات کو بنیاد بنایا جائے، نہ کہ محض عقیدت اور جذبات میں حضورؐ سے ایسی باتیں منسوب کی جائیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کے بارے میں ان کی رباعیات کسی نہ کسی آیت قرآنی کی وضاحت کررہی ہیں۔''

راقم یہاں ان جملوں کو آگے بڑھا کر یہ کہنا چاہتا ہے کہ تجمل کے سلام، بلکہ تمام کلام میں بھی وہی احتیاط کو پیش نظر رکھا گیا۔ بہرحال یہ بھی محمدؐ کی آل ہے۔ یہ آلِ محمدؐ ہیں اور اہلِ بیتؑ اطہار کے شاعر تجمل ہے:

موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہلِ بیتؑ کہلاتا ہے

تجمل آفندی علامہ اقبال کی فکر سے بہت متاثر تھے۔ وہ قنوطی اور منجمد صوفیانہ روش کے خلاف تھے۔ وہ اقبال کی طرح رسم شبیریؑ کے ادا کرنے پر زور دیتے تھے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؑ
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

یہاں نجم کا لہجہ بے باک ہے۔ رسالت کا منصب نبھانا ہے کیونکہ ایسی شاعری جزو پیغمبری ہے۔

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

نجم اسوۂ شبیرؑ کو انسان کی عالی اقدار کو جگانے اور سنوارنے کے لیے لازم ومفید جانتے ہیں۔ چند اشعار سلام سے اسوۂ انصار اور اسوۂ شبیرؑ پر دیکھئے:

چند لفظوں میں یہ ہے اُسوۂ انصارِ حسینؑ وسعتِ فکر و نظر حوصلۂ عزم و عمل

بیٹھ کر مجلس میں روئے اُٹھ کے ماتم بھی کیا اسوۂ انصار کی تقلید سے کیا کام ہے

یہ نہ قرآں میں نہ قرآن کی تفسیر میں ہے روحِ احساس وعمل اسوۂ شبیرؑ میں ہے

ملی نہ اسوۂ شبیرؑ سے مدد جب تک یزیدِ وقت کوئی بے نقاب ہو نہ سکا

ذہن میں اسوۂ شبیرؑ کا معیار آئے ہاتھ میں صبر کا دامن ہو کہ تلوار آئے

اُسوۂ محنت کشانِ کربلا تعلیم کر اُٹھ صفِ ماتم بچھا کر قوم کی تنظیم کر

عربی، فارسی اور اردو شاعری میں کسی کا خطاب بجز نجم آفندی، شاعرِ اہل بیتؑ، نہ ہوا۔ یہ خطاب نجم آفندی کے نام کی دستار بن گیا۔ قرآن اور اہل بیتؑ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور رہے گا۔ حدیث ثقلین کی رو سے قرآن سامت اور قرآن ناطق (اہل بیتؑ) کو کوئی جدا نہیں کرسکتا۔ رثائی ادب اور نعت گویوں نے اس مضمون پر عمدہ اشعار لکھے لیکن اس موضوع پر نجم فلک سخن پر نجم نہیں بلکہ خورشید درخشاں ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم صرف چند شعروں پر اکتفا کریں گے۔

یہ شانِ ولا اے دلِ ناکام نہیں　　اب تک بھی اخوت کی روش عام نہیں
عترت سے محبت کا ہے دعویٰ لیکن　　آپس میں محبت کا کہیں نام نہیں

بندے جنھیں کلام ہے عترت کے باب میں　　اصلاح دے رہے ہیں خدا کی کتاب میں

کلام اللہ کی تفسیر ہے ہر فرد عترت کا　　نظر کر ان کی سیرت پر ذرا تفسیر سے پہلے

دامنِ آلِ نبیؐ ہاتھ سے چھوٹے کیوں کر　　اس سے بہتر نہیں قرآن کی تفسیر کوئی

چھوڑ کر عترت کا دامن کیا مسلماں لے گئے　　روحِ قرآں چھوڑ دی، الفاظِ قرآں لے گئے

قرآن جس میں اُترا ہے وہ گھر نہ ڈھونڈ لیں　　تفسیر ڈھونڈتے ہیں جو قرآن کے لئے

ڈاکٹر شارب ردولوی ''تنقیدی مطالعے'' میں لکھتے ہیں۔''سلام کے کہے جانے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد عام تھا اور روز ہی اس طرح کی محفلیں کہیں نہ کہیں ہوتی رہتی تھیں، لیکن ایام عزا کے احترام میں عشقیہ شاعری یا غزلوں وغیرہ کا کہنا یا سنانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس زمانے میں غزل کے بدل کے طور پر سلام کہے جاتے تھے اور مشاعرے کے بجائے مسالمے کی محفلیں ہوتی تھیں، اس طرح ایک طرف شعر کوئی کے جذبہ کی تسکین ہوجاتی تھی اور دوسری طرف ایام عزا کے احترام اور ثواب کا مقصد بھی پورا ہوجاتا ہے۔''یعنی بالفاظ دیگر سلام مذہبی غزل کی شکل میں نمودار ہوا، اس لیے اس میں تغزل کی چاشنی ہے۔ امداد امام اثر نے بھی کہا تھا کہ اگر سلام کے بعض اشعار غزل میں داخل کر دیے جائیں تو غزل کے اشعار سے انھیں جدا کرنا آسان نہیں۔ جو فطری شاعر ہوگا اس میں شعریت ہوگی جس کو مختلف صنفوں میں مختلف ناموں سے بیان کر سکتے ہیں۔ چونکہ سلام اور غزل کی ہیئت ایک ہی قسم کی ہے اور بعض اوقات ہر شعر علاحدہ مضمون یا غزل مسلسل کی طرح ایک ہی مضمون کا

تسلسل ہے، شعرا نے اپنے تغزل کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ مرزا عشق اور میر مونس کے سلاموں سے کون واقف نہیں۔ میر انیس کے 113 سلام، مرزا دبیر کے 134 سلام، مبکی سلام نہیں، بلکہ تغزل کے عالی نمونے ہیں۔

شبیہہ امامِ زماں کھینچتے ہیں تصور میں تصویرِ جاں کھینچتے ہیں
(انیس)

خاکساروں کا ہر اک دھبہ سے دامن پاک ہے گرد آلودہ نہیں ہوتی زمیں پر چاندنی
(دبیر)

ان اشعار کے ہر لفظ سے تغزل ٹپک رہا ہے۔

نجم آفندی کے جملہ سلام (107) ہیں۔ ہر سلام کا ایک عنوان ہے۔ سلاموں میں کم سے کم (6) اور زیادہ سے زیادہ (26) اشعار ہیں۔ سلاموں کے کل اشعار کی تعداد (1375) ہے۔ سلاموں کے مطلعوں اور مقطعوں میں غضب کی شعریت اور جدت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی کے اوائل میں جب اوج، عروج، رشید، سلاموں میں نیا رنگ بھر رہے تھے کہیں بہاریہ مضامین اور ساقی ناموں کو داخل کیا جا رہا تھا، لیکن مجری، مجرا، سلام، سلامی، سلام علیک، جیسے الفاظ کو ترک کرنے کی ہدایت مل رہی تھی۔ اسی زمانے میں نوجوان نجم سن رہا تھا۔ چنانچہ ایسے سلام رثائی ادب میں نجم کے کلام سے داخل ہوئے اور پھر دبستان نجم کے نقیب بن کر کہیں شہید یار جنگ کے سلاموں کے مجموعوں پر اثر انداز ہوئے اور پھر آج جہاں کہیں بھی سلام کہے جا رہے ہیں وہ دبستانِ نجم ہی کی دین ہیں۔ مضمون کی طوالت کو دیکھتے ہوئے اس گفتگو کے آخر میں سلاموں کے کچھ اشعار مشتے نمونہ از خروارے درج ہیں۔

یہ گریہ نہیں ہے یہ آنسو نہیں ہیں یہ دادِ وفا ہے جو دی جا رہی ہے

قتلِ اولادِ نبیؐ پر نعرۂ تکبیر تھے ہائے کیا مصرف ہوئے ہیں نعرۂ تکبیر کے

خلقِ عظیم سے اُسے نسبت ہو کس طرح جو قوم چھ مہینے کے بچے کو مار دے

کس طرح جگہ ملتی اغیار کو اس گھر میں
دھبّہ نہیں آسکتا تطہیر کی چادر میں

مولاؑ کے غلاموں میں جبریلؑ ہیں میں بھی ہوں
بس فرق ہے اتنا سا میں در پہ ہوں وہ گھر میں

ضرورت ہے مصلّے کی فضا میں قوتِ دل کی
مسلماں یا علیؑ کہہ نعرۂ تکبیر سے پہلے

ہم اہلِ بیتؑ کے ہیں ایسے ماننے والے
کہ جن میں میثمِ تمّار سا دلاور ہے

قلم کے بدلے اٹھالیں گے وقت پر تلوار
مجھے یقیں ہے یہی عزمِ ہر سخن ور ہے

شرف پایا اُسی نے دفن کرنے کا پیمبرؐ کے
جو واقف تھا مقامِ امتزاجِ روح و پیکر سے
ہمیں اللہ کے بندوں سے بس اتنا ہی کہنا ہے
نبیؐ لائے تھے اپنا جانشیں اللہ کے گھر سے

قرآن میں خدا نے مودّت کہا جسے
یہ بھی حسینیتؑ کا حقیقت میں نام ہے

چہرۂ روشن دکھا کر فطرتِ اسلام کا
کلمہ پڑھوا دے حسینؑ ابن علیؑ کے نام کا

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزّت کی موت سستی ہے

ہشیار تو لیتے نہیں قرآں سے سبق
بے ہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

بے ماتمِ حسینؑ سحر ہے نہ شام ہے جس دن یہ غم تمام ہے دنیا تمام ہے

اپنی طرف سے چھیڑ نہ اپنی طرف سے جنگ یہ مسلکِ حسینؑ علیہ السلام ہے

میرے لئے آرام کہاں مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب

علیؑ کا نام ہی کافی ہے سُن رکھے دنیا ہزار وار پہ ہم ایک وار کرتے ہیں

نجم کے سلاموں کا تنقیدی جائزہ ابھی پوری طرح سے نہ ہوسکا۔
اور اگر ہو جائے تو بقول نجم:

بہت پیام ملیں گے مرے سلام میں نجم
نگاہِ غور سے نقاد نے اگر دیکھا

○

منتخب اشعار

اگر انساں کو عرفانِ غمِ شبیرؑ ہوجائے
شعورِ حریت دنیا میں عالم گیر ہوجائے
اگر منشائے فطرت خود نہ ہو کیونکر یہ ممکن ہے
کسی کا موت کا غم اور عالم گیر ہوجائے

اللہ رے صداقت سادات کے لہو کی
کیسا بھرا پڑا ہے اُجڑا ہوا گھرانہ

بندے جنھیں کلام ہے عترت کے باب میں
اصلاح دے رہے ہیں خدا کی کتاب میں
اقرار باللسان کر اے بندۂ خدا
رکھتا ہے الفتِ شہؑ مرداں حجاب میں
دل ہو نہ ہو زباں تو نصیری ضروری تھی
جب منہ کھلا کنندۂ خیبر کے باب میں
تحقیق کا جنون ہے فکرِ عمل نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو کرب و بلا کی کتاب میں

بت لاکھ بھی توڑے کوئی حیدرؑ نہیں ہوتا
وہ دوشِ پیمبرؐ تو میسّر نہیں ہوتا
یہ شان ہوئی ختم حسینؑ ابن علیؑ پر
اب عشق کا سجدہ تہ خنجر نہیں ہوتا
ہم کود کے بچوں کو بھی کردیتے ہیں شامل
جب تکملۂ قوتِ لشکر نہیں ہوتا
آسان ہے قربانی و ایثار پہ تقریر
میدان عمل کچھ سرِ منبر نہیں ہوتا

پاؤں عابدؑ کا نئی راہ کی تعمیر میں ہے
پاؤں وہ پاؤں جو الجھا ہوا زنجیر میں ہے
یہ نہ قرآں میں نہ قرآن کی تفسیر میں ہے
روحِ احساس و عمل اسوۂ شبیرؑ میں ہے
اللہ اللہ یہ اجمالِ جمالِ قدرت
وسعتِ کون و مکاں چادرِ تطہیر میں ہے
جس کی وحدت میں ہو قرآن کا سارا مفہوم
ایسا نقطہ بھی کوئی کثرتِ تحریر میں ہے
ایک ہی شانِ عمل ہے وہ حسنؑ ہو کہ حسینؑ
صلح میں بھی ہے وہی کاٹ جو شمشیر میں ہے

ایک ہی گھر چاہیے قرآن و عترت کے لئے
تنگ دل حق سے دعا کر دل کی وسعت کے لئے

یہ ترا ذوقِ عبادت اے حسینؑ ابن علیؑ
زیرِ خنجر بھی جگہ کر لی عبادت کے لئے

جرأت عباسؑ تک پہنچے گی کیا عقلِ بشر
اک نیا موقف بنایا ہے شہادت کے لئے

دل پہ ظاہر ہو گئے کیا کیا علیؑ کے مرتبے
لفظ اب ملتے نہیں اسرارِ قدرت کے لئے

جب سے قتلِ سبطِ پیغمبرؐ پہ تکبیریں کہیں
گھٹ گیا اُس دن سے زورِ نعرۂ تکبیر بھی

عزمِ خالص چاہیے حُر کے ارادے کی قسم
بڑھ گیا آگے تو پیچھے ہٹ گئی تقدیر بھی

قربان ایسی موت کے جو خود ہو زندگی
پیمانہ حیات ہے پیمانِ کربلا

یہ گریہ نہیں ہے یہ آنسو نہیں ہیں
یہ دادِ وفا ہے جو دی جا رہی ہے

قتلِ اولادِ نبیؐ پر نعرۂ تکبیر تھے
ہائے کیا مصرف ہوئے ہیں نعرۂ تکبیر کے

قید و قتل و تشنگی و غربتِ آلِ نبیؐ
کیسے پُرغم ہیں عناصر قوم کی تعمیر کے

جگا رکھا ہے تیرہ سو برس سے جس نے دنیا کو
اک ایسی رات بھی اس مرنے والے نے گزاری ہے

نکھرتے ہیں غمِ شبیرؑ سے اخلاقِ انسانی
یہی غم ہے کہ جس سے زندگی کی آبیاری ہے

کہاں اک مسند پُر زر کہاں سجدہ تہِ خنجر
وہ دنیاوی حکومت ہے یہ دینی شہر یاری ہے

خلقِ عظیم سے اُسے نسبت ہو کس طرح
جو قوم چھ مہینے کے بچے کو مار دے

دنیا کے غم کو چھوڑ کے لے لو غمِ حسینؑ
غم ان کا ہو تو داغِ جگر بھی بہار دے

عالم انسانیت کو سال بھر میں ایک بار
سرحدِ روحانیت میں کھینچ لاتے ہیں ہم

جو حریت کی راہ بنا کر گئے حسینؑ
راہیں نکل رہی ہیں اسی شاہراہ سے

کیوں اس کی یادگار منائیں نہ اہلِ دل
جذباتِ حریت کا جو پروردگار ہو

مقتل نہ تھا حسینؑ کا دربارِ عام تھا
ہاتھوں پر سر لئے ہوئے اہلِ وفا گئے
سائے میں تیغِ ظلم کے سو کر اجل کی نیند
جسمِ بشر میں روحِ شرافت جگا گئے

جینے کا اختیار تھا مرنا کیا پسند
کیا جبر و اختیار پہ قدرت ہے اے حسینؑ

پڑھ کر نمازِ عصر کی شبیرؑ زیرِ تیغ
اک عصرِ نو کی خلق میں تعمیر کر گئے

بالا ہی رہی شانِ علیؑ ذہنِ بشر سے
دنیا نے بہت کام لیا فکر و نظر سے
مدحت کے ترانے میں بڑا وزن ہے واعظ
اک حرف ہے بھاری تری تسبیحِ گہر سے
ہوتا نہ اشارہ جو حسینؑ ابنِ علیؑ کا
ہرگز نہ بدلتی شبِ عاشور سحر سے
روتے ہیں جو اس دور کے کشتوں کو مسلماں
وہ آنکھ ملائیں تو میرے دیدۂ تر سے
کھلتی نہیں تائید میں کیوں ان کی زبانیں
دل جن کے تڑپ جاتے ہیں ماتم کے اثر سے

لا اسلکم کہہ کے مودّت جو طلب کی
قرآں نے رکھا تاجِ سرِ اہلِ ولا پر
جب میں نے دعا کی تو زیارت کی دعا کی
اللہ کی رحمت ہے مرے دستِ دعا پر

شبیرؑ کی روداد ہو فطرت کی زباں ہو
باز آئیں جو انساں تو فضا مرثیہ خواں ہو
میدان میں باطل کے لیے حجّت آخر
قدرت کا یہ منشا تھا کہ اصغرؑ کی زباں ہو
ہوتی ہے لطافت وہ عجب مدحِ علیؑ کی
مفہوم پہ جب خلعتِ الفاظ گراں ہو